بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

"حقوقِ نسواں کمیٹی برائے پاکستان" خلع کے پردے میں جس طرح کا غیر مقید اور بے دریغ "حق طلاق" عورت کو دینا چاہتی ہے اور طلاق کے بعد جس طرح مطلقہ کو طلاق دہندہ کی جائداد منقولہ و غیر منقولہ میں حصہ دار بنانا چاہتی ہے، اس پر ترجمان کے دو سابق شماروں میں ضروری بحث کی جا چکی ہے اور دلائل و براہین سے یہ امر واضح کیا جا چکا ہے کہ یہ دونوں سفارشیں کتاب و سنت کی تعلیمات اور عقل و انصاف کے مقتضیات سے کس قدر دور ہٹی ہوئی ہیں۔ یہ دراصل مغربی تہذیب و تمدن سے مفتوح و مغلوب ذہن کی پیداوار ہیں، ان سے مسلمانوں کے ازدواجی مسائل و مشکلات میں سے کوئی مشکل آسان نہیں ہو سکے گی، البتہ فرنگی اقوام کے طور طریقوں کو یہاں رائج کرنے میں ضرور مدد ملے گی۔ اب تک کی بحث میں رپورٹ کی دفعہ ۴۰ تک کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔ اب ہم اس سفارش کو لیتے ہیں جو دفعات ۴۱، ۴۲، ۴۳ میں تجویز کی گئی ہے۔ اس سفارش کا ترجمہ درج ذیل ہے:

"کمیٹی یہ محسوس کرتی ہے کہ طلاق کے بعد اپنی بیوی کو نان و نفقہ دینے کی شوہر کی ذمہ داری "عدت" کا زمانہ گزرنے کے بعد ختم نہیں ہونی چاہیے۔ جیسا کہ اس سے پہلے دیکھا گیا ہے کہ ایسی صورتیں ہیں جہاں سابق بیوی کے پاس کوئی علیحدہ و جداگانہ ذریعۂ معاش نہیں ہوتا ہے۔ اور اس طرح "عدت" کا زمانہ گزرنے کے بعد اسے سنگین معاشی اور مالی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ موجودہ قانون کے تحت شوہر کو آزادی ہے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے خواہ وہ اس کے ساتھ کتنی ہی مدت کے لیے رہ چکی ہو۔ عمر رسیدہ عورتوں کی صورت میں شوہر کی طرف سے استعمال کردہ طلاق کے حق کا نتیجہ واقعی سخت اذیت کی صورت میں نکلتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس عمر میں اس کے لیے دوسری شادی کرنا ممکن نہ ہو اور اسی طرح اس کے لیے یہ بھی ممکن نہ ہو کہ اپنی معاش خود کمائے۔ کمیٹی کا خیال ہے کہ شوہر کی طرف سے طلاق کے حق کا خود اختیاری استعمال کسی حد تک روکا جا سکتا ہے اگر شوہر کو حکم دیا جائے کہ وہ ایک خاص مدت کے لیے اپنی سابق بیوی کا مالی بوجھ اٹھائے۔

کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ:

شوہر کی طرف سے طلاق کی صورت میں اسے حکم دیا جائے کہ عدت کے زمانے کے علاوہ شادی شدہ زندگی کے ہر سال کے لیے ایک ماہ کے حساب سے شمار کی جانے والی مدت کے لیے اپنی سابق زوجہ کو نان ونفقہ ادا کرے۔"

اس کمیٹی کی رپورٹ میں ایک عجیب چیز جو مشاہدے میں آرہی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے وہ ایک انتہائی نادر الوقوع صورت فرض لیتی ہے جس میں خاوند بڑا ظالم وسنگدل اور بیوی بے حد مظلوم ومعصوم دکھائی دیتی ہے اور پھر اس صورت کو ایک عامۃ الورود اور آئے دن پیش آنے والا واقعہ قرار دے کر کمیٹی اس کے لیے ایک عام قانونی سفارش پیش کر دیتی ہے۔ چنانچہ دفعہ ۴۰ میں جب مطلقہ کو طلاق دہندہ کی جائداد میں حصہ دار بنانے کا مطالبہ کیا گیا تو اس کے لیے یہ دلیل دی گئی کہ:

"بعض اوقات شوہر کی طرف سے بستر مرگ پر بھی حقِ طلاق اس خیال کے پیش نظر استعمال کیا جاتا ہے کہ اس کی موت کے بعد بیوی کو اس کی جائداد میں سے حصہ کا دعویٰ کرنے سے محروم کر دیا جائے۔"

یہاں بسترِ مرگ پر طلاق دینے کی جو مثال دی گئی ہے وہ بالکل شاذ ونادر ہے اور اس سے جو نتیجہ اخذ کیا جا رہا ہے وہ قوانین شرعیہ سے بے خبری پر دلالت کر رہا ہے۔ اسلامی قانونِ وراثت کا یہ مسئلہ معروف ومسلم ہے کہ مرض الموت کی طلاق خواہ مغلظہ ہی کیوں نہ ہو وہ مطلقۂ معتدہ کو محروم الارث نہیں کر سکتی۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے اپنی اہلیہ کو ایسی طلاق دی تھی اور عدت گزرنے سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا تو خلیفہ راشد حضرت عثمانؓ نے مطلقہ کو حضرت عبدالرحمٰنؓ کی میراث میں سے حصہ دلایا[1]۔ یہ مسئلہ صحابہ کرام کے مجمع عام میں پیش ہوا، اور سب نے اس سے اتفاق کیا۔ عورت کا یہ حقِ میراث صرف طلاقِ مریض تک محدود نہیں بلکہ فقہاء نے اس پر قیاس کر کے "طلاق الفار" میں بھی عورت کو وارث قرار دیا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک مرد قتل کے مقدمے میں ماخوذ ہے، یا دشمن سے لڑ رہا ہے، یا پُرخطر سفر پر روانہ ہو رہا ہے، یا کسی دوسرے

---

[1] موطا امام محمد اور بعض دیگر ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کی وفات عدت گزر جانے کے بعد ہوئی۔ چنانچہ امام مالک اور بعض فقہاء اس صورت میں بھی وراثت کے قائل ہیں۔

مہلک حادثے کی زد میں ہے اور وہ عورت کو طلاق دے دیتا ہے تو یہ طلاق بھی عورت کے لیے مانع وراثت نہ ہو گی۔ اب کمیٹی کے معزز ارکان سے ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ بستر مرگ کی طلاق جب صحابہ کرام اور فقہائے اسلام کے اجماع کے مطابق مطلقہ کی وراثت پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تو آپ مورث کی وفات سے پہلے ہی اس کی جائداد کے حصے بخرے کیوں کرنا چاہتے ہیں؟

بہرکیف خواتین پاکستان سے بے پناہ اور بے حساب ہمدردی و شفقت کا یہ کرشمہ ہے کہ کمیٹی نے مطلقہ کو سابق شوہر کی جائداد میں حصہ دار بنانے ہی پر بس نہیں کیا بلکہ مزید یہ بھی محسوس فرمایا کہ "طلاق کے بعد اپنی بیوی کو نان و نفقہ دینے کی شوہر کی ذمہ داری عدت کا زمانہ گزارنے کے بعد ختم نہیں ہونی چاہیے" (دفعہ ۴۱) - یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ طلاق دینے اور عدت گزر جانے کے بعد نان و نفقہ کی یہ ذمہ داری طلاق دینے والے پر ڈالنے کے لیے آخر شرعی یا عقلی بنیاد کیا ہے؟ "اپنی بیوی" اور "شوہر" کے الفاظ استعمال کر کے کیا یہ تاثر پیدا کرنا مقصود ہے کہ عدت کے بعد بھی رشتۂ ازدواج منقطع نہیں ہوا، اس لیے طلاق دینے والے کو مطلقہ کے اخراجات کا ایک حصہ ادا کرتے رہنا چاہیے؟ اگر فی الواقع ان تجاویز کے تحت یہی تصور کام کر رہا ہے تو ہم صاف طور پر کہیں گے کہ یہ ایک خالص ہندوانہ اور مسیحیانہ تصور ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے - ہندوؤں اور عیسائیوں کے ہاں یہ نظریہ صدیوں تک رائج رہا ہے اور اس کے اثرات اب تک موجود ہیں کہ رشتۂ ازدواج دائمی اور ناقابل انقطاع ہے۔ اس لیے طلاق و تفریق کے باوجود سابق خاوند کو اس امر کا مکلف سمجھا گیا ہے کہ وہ اپنی مطلقہ کی ضروریاتِ زندگی فراہم کرتا رہے۔ مطلقہ کے ان اخراجاتِ پرورش کو مغربی ممالک میں ALIMONY کا نام دیا گیا ہے۔ ارکانِ کمیٹی نے غالباً بربنائے مصلحت اپنی اصل رپورٹ میں اس مغربی اصطلاح کے استعمال سے گریز کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مطلقہ کو طلاق دینے والے کی جائداد سے حصہ دلا کر اور حصہ دلانے کے بعد اس پر مطلقہ کے نفقہ کا مزید مالی بار عاید کر کے اُسی غیر اسلامی تصور کی داغ بیل اسلامی معاشرے میں ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اگر ایک دفعہ یہ بنیاد پڑ گئی اور اس اصول کو تسلیم کر لیا گیا کہ وقوعِ طلاق اور انقضائے عدت کے بعد بھی مطلقہ کے اخراجاتِ حیات کا بار طلاق دینے والے پر ڈالا جا سکتا ہے تو اس کے بعد وہی سب کچھ ہو گا جو مغرب میں ہو رہا ہے اور جس کے نتیجے میں اکثر گھروں کا امن و سکون غارت ہو چکا ہے۔

مطلقہ کی پرورش MAINTENANCE کا یہ تخیل جو دیارِ مغرب میں مروج ہے اور جس کا چلن عام کرنے کی تجویز و تدبیر یہاں کی جا رہی ہے اس کا کوئی تعلق نان و نفقہ کی اُن صورتوں سے نہیں ہے جو اسلام میں معروف و مسنون ہیں۔ عورت جب تک خاوند کے نکاح میں ہے، اس کا نان و نفقہ فراہم کرنا خاوند پر فرض ہے خواہ عورت صاحبِ جائداد و املاک ہی کیوں نہ ہو۔ اگر مرد نفقہ فراہم نہ کرے تو عورت اسے بذریعہ قانون وصول کر سکتی ہے یا خاوند کے نام پر قرض لے سکتی ہے جس کی ادائیگی خاوند ہی کے ذمے ہو گی۔ اگر عورت کو خدانخواستہ طلاق ہو جائے تو وہ عدت کے دوران میں بھی خاوند ہی سے نفقہ لے گی۔ اگر وہ حاملہ ہے اور طلاق ہوئی ہے تو نہ صرف ایام حمل بلکہ بچے کی مدتِ شیر خوارگی کے ایام میں بھی زچہ و بچہ کے اخراجات بچے کے والد کے ذمے ہوں گے۔ والد کی جو اولاد بھی اس عورت سے ہو گی وہ دودھ چھڑانے کے بعد بھی اگر والدہ چاہے تو اپنی تحویل میں لے سکتی ہے۔ اگر لڑکا ہے تو وہ سات سال تک اور لڑکی ہے تو نو برس تک، یا ایک قول کے مطابق بالغ ہونے تک اسے والدہ اپنے پاس رکھ سکتی ہے اور اس اولاد صغار کے جملہ اخراجات والد ہی کے ذمہ ہوں گے۔ عورت صرف اُسی صورت میں اس حقِ حضانت سے محروم ہو سکتی ہے جبکہ وہ کسی ایسے مرد سے نکاح ثانی کرے جو اولاد کے لیے اجنبی اور غیر محرم ہو۔ اور سابق خاوند یہ مطالبہ کرے کہ میری اولاد مجھے واپس دلائی جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے بعد بھی مطلقہ کو سابق شوہر کی جائداد اور معاش میں مزید شریک بنانا کس اصول کے تحت جائز و روا ہو سکتا ہے؟

کمیٹی کی رپورٹ یہ کہتی ہے کہ فرض کیا عورت بوڑھی ہے اور بے اولاد بھی ہے، بڑھاپے میں اسے طلاق مل جاتی ہے تو اس کا پرسانِ حال کون ہو گا؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ جو عورت بے اولاد ہو گی (اور آپ عورتوں اور مردوں کو بانجھ بنانے کی پہلے ہی سعی فرما رہے ہیں) وہ مشکل ہی سے بڑھاپے تک ایک ہی خاوند کے پلے بندھی رہے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے پہلے نکاح کا جلد ازالہ ہو جائے اور وہ دوسرا نکاح کر لے۔ یا پھر میاں بیوی دونوں صابر و شاکر ہیں اور اپنی جوانی کو یکجا رفاقت کے ساتھ بڑھاپے میں تبدیل کرتے ہیں تو شاید ہی کوئی خاوند ایسا بُرا اور ناقدرا ہو گا جو ایسی بیوی کو جوانی میں تو نہیں مگر سن رسیدگی کے عالم میں طلاق دے گا۔ پھر بھی ہم مانے لیتے ہیں کہ ہمارے فاسد معاشرے میں ایسی صورتوں کا وقوع ممکن ہے اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی بے سہارا عورتوں کی دستگیری کون کرے گا؟ مگر یہ سوال صرف بوڑھی بے اولاد مطلقات تک محدود نہیں

ہے بلکہ یہ سوال معاشرے کے ان تمام نادار و محتاج افراد کے بارے میں پیدا ہوتا ہے جن میں بچے، نوجوان، بوڑھے مرد، عورتیں سب شامل ہیں، جو معذور، بے کار اور بے یار و مددگار ہیں۔ اسلام ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ ایسے افراد کے اگر خوشحال عزیز اور قرابت دار موجود ہوں تو ان پر لازم ہے کہ وہ صلہ رحمی کے اصول پر اپنے ان رشتہ داروں کی کفالت کریں، اگر وہ نہ کریں تو بستی یا آبادی کے سب لوگ حسبِ استطاعت ان کی مدد کریں۔ اور یہ بھی نہ ہو تو اسلامی ریاست کی یہ ناگزیر ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے تمام غیر مستطیع شہریوں کی اعانت بیت المال سے کرے، جس پر ایسے تمام افراد کا یکساں حق ہے جو کسی عذرِ معقول کی بناء پر اپنی معاش کے حصول سے عاجز ہوں۔ لیکن جہاں تک ایک مطلقہ خاتون اور اس کے سابق شوہر کا تعلق ہے، عدت گزر جانے کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے قطعاً اجنبی اور غیر محرم ہیں اور ایک دوسرے پر ان کے مالی حقوق و واجبات رشتۂ ازدواج کے انقطاع کے بعد از سر نو کسی درجے میں بھی پیدا نہیں ہو سکتے۔ جہاں تک نان و نفقہ کا تعلق ہے اسلامی شریعت میں اس کے وجوب کی چند متعین صورتیں ہیں۔ مثلاً والدین بالخصوص جب وہ محتاج ہوں، ان کا نان و نفقہ بالغ اولادِ نرینہ کے ذمہ ہے۔ اولاد جب تک نابالغ اور غیر شادی شدہ ہے اس کا نفقہ والد کے ذمہ ہے۔ بلوغ و نکاح کے بعد اگرچہ والد کا رشتۂ نسب اولاد سے منقطع نہیں ہوتا مگر والد پر اولاد کے نان و نفقہ کے قانونی حقوق ختم ہو جاتے ہیں۔ اگر مطلقہ اپنے سابق خاوند سے نفقہ یا حصہ جائداد کی حقدار ہوتی تو غریب بالغ اولاد اور بہن بھائی بدرجہ اولیٰ اس کے مستحق تھے کہ ان کو بھی نفقہ اور جائداد سے حصہ ملتا۔

کمیٹی کا اگر یہ خیال ہے کہ مطلقہ کے اس نئے مالی حق کی تخلیق سے طلاق میں کمی ہو جائے گی تو یہ خیال بھی بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ مغربی ممالک میں، جیسا کہ بیان ہوا، بالعموم مطلقہ کو خرچہ دلوایا جاتا ہے اور طلاق یا تفریق بھی عدالت ہی کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ان ممالک میں طلاق کی بھرمار ہے۔ اور کمیٹی کے ارکان ہم سے زیادہ اس بات سے واقف ہیں کہ وہاں رشتۂ ازدواج ایک تارِ عنکبوت، ایک کچا تاگا بن کر رہ گیا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے روزنامہ "سن" لاہور کا ۲۹ اگست کا شمارہ ہے۔ اس کے صفحہ ۹ پر آسٹریلیا کے قومی شماریات بورڈ کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۴ء تک طلاق کی تعداد میں چھیاسٹھ فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ اس بورڈ کے اندازے کے مطابق اس سال کے آخر تک

عدالتوں کے ذریعے سے پچاس ہزار طلاقوں کا نفاذ ہو چکا ہوگا۔ اس رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ طلاق کی رفتار میں ترقی اس امر کے باوجود ہے کہ نکاح کی شرح میں اضافہ کی بجائے کمی واقع ہو رہی ہے، کیونکہ بہت سے جوڑے اب نکاح کو ایک فرسودہ رسم سمجھتے ہیں، جب چاہتے ہیں آزادی سے یکجا ہوتے ہیں، جب چاہتے ہیں جدا ہو جاتے ہیں۔ نکاح و طلاق کے جھنجھٹ ہی میں نہیں پڑتے۔ ظاہر ہے کہ آسٹریلیا اتنا "ترقی یافتہ" نہیں ہے، جتنا کہ امریکہ، فرانس یا رُوس ہے۔ اس لیے ان ممالک کا حال آسٹریلیا سے بہتر نہیں، بلکہ بدتر ہی ہوگا چنانچہ امریکہ کے ایک رسالے اَویک (AWAKE) کے ۸ رجون ۱۹۷۶ء کے شمارے میں بتایا گیا ہے کہ گزشتہ سال وہاں دس لاکھ چھبیس ہزار طلاقیں نافذ کی گئیں اور یہ تعداد گزشتہ سالوں سے دُگنی ہے۔ گزشتہ برس کل نکاحوں کی تعداد بیس لاکھ دس ہزار ہے، گویا کہ ہر دو شادیوں میں سے ایک کا خاتمہ طلاق پہ ہوا۔ مضمون نگار نے خود تسلیم کیا کہ یہ صورتِ حال عائلی زندگی کی عمومی تباہی (GENERAL BREAK DOWN OF FAMILY LIFE) کا بیّن ثبوت ہے۔ اس سے ہر پاکستانی مسلمان بآسانی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ جو نسوانی حقوق" یہ کمیٹی ہماری خواتین کے سر منڈھنا چاہتی ہے اس کا نتیجہ بالآخر کیا نکلے گا؟

"سر منڈھنے" کا لفظ ہم یونہی استعمال نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہم اسے خوب سوچ سمجھ کر پوری ذمہ داری کے ساتھ استعمال کر رہے ہیں۔ ہمیں اس بات کا کامل یقین ہے کہ ہمارے ملک کی ننانوے بلکہ ساڑھے ننانوے فی صد سے بھی زیادہ خواتین صرف وہ حقوق مانگتی ہیں جو قرآن و سنت میں مذکور ہیں، یا جنہیں فقہائے اسلام نے قرآن و حدیث سے اخذ کر کے پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور اس سے زیادہ کسی شے کا مطالبہ نہیں کرتیں۔ یہ کمیٹی جس نے یہ رپورٹ تیار کی ہے اس کے ارکان پاکستانی خواتین کے ہرگز نمائندہ نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض مرد اور عورتیں سرکاری ملازم ہیں، بعض کو مرد ارکان اسمبلی نے چُنا ہے اور بعض ایسی ہیں جو محض انگریزی اخبار نویس یا تعلیم گاہ کی صدر معلّمہ ہیں۔ پاکستان کی کسی مسلمان خاتون کو اگر نکاح یا طلاق یا وراثت یا حضانت کا کوئی خانگی مسئلہ درپیش ہو، تو وہ اس کمیٹی کے کسی ممبر کی طرف ہرگز رہنمائی کے لیے رجوع نہیں کرے گی۔ ایسی غیر نمائندہ اور نااہل کمیٹی کو آخر یہ حق کس طرح دیا جا سکتا ہے کہ وہ مسلم خواتین کے ازدواجی معاملات میں مداخلت کرے اور انہیں اس راہ پر لے جانے کی کوشش کرے جس پر وہ جانے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ اس طرح کی ایک ناکام اور نامعقول سعی ایوب خاں صاحب نے بھی کی تھی اور ۱۹۶۱ء میں فیملی لاز آرڈی ننس بنایا تھا جس کی رہی سہی کسر

اب موجودہ حکومت کی مقرر کردہ کمیٹی پوری کر رہی ہے۔

ہمارے فقہاء نے طلاق کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے ضمناً یہ بات بھی لکھ دی ہے کہ اگر خاوند بیوی کو طلاق کا حق تفویض کر دے اور یوں کہہ دے کہ تو جب چاہے میری طرف سے اپنے اوپر طلاق وارد کر سکتی ہے اور عورت اس تفویض کو قبول کرے تو عورت اپنا یہ حق استعمال کر سکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایوب خاں صاحب کے مارشل لاء میں جن لوگوں نے عائلی قوانین مرتب کیے تھے انہیں یہ نکتہ کہیں سے ہاتھ لگ گیا اور انہوں نے نکاح کی رجسٹریشن کے لیے جو فارم مقرر کیا اس میں اس سوال کو باقاعدہ طور پر درج کر دیا گیا کہ عورت کو نکاح کے وقت حقِ طلاق تفویض کیا گیا یا نہیں؟ یہ گویا ہر عورت کو یہ سمجھانا تھا کہ تم نکاح کے وقت اس حق کا مطالبہ کرو۔ اور اسے حاصل کر کے جب چاہو بلا تامل استعمال کرو۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے مسلم معاشرے کا بگاڑ اپنی آخری حد کو نہیں پہنچا۔ یہ قانون جوں کا توں موجود ہے لیکن نکاح کا فارم پُر کرتے وقت بالعموم اس تفویض طلاق والی شق کو قلم زن کر دیا جاتا ہے اور کوئی دلہن یا اس کا ولی اس بدعت کو پسند نہیں کرتا کہ طلاق کی باگ ڈور خاوند سے چھین کر بیوی کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ پاکستان کی مسلمان خواتین کا تفویضِ طلاق کے حق کو مانگنے کی کوشش نہ کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ اللہ کے فضل سے ابھی تک اسلامی اقدار کا پاس اور لحاظ رکھتی ہیں۔ اور ان کی عائلی زندگی میں شریعت نے حقوق و واجبات کی جو ترتیب و تحدید مقرر فرما دی ہے وہ اس سے تجاوز کرنا نہیں چاہتیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ "آزادیٔ نسواں" کے وکیلوں اور حامیوں نے اس سے کوئی سبق نہیں سیکھا اور وہ برابر اس بات پر مُصر ہیں کہ وہ مرد اور عورت کے مابین مودّت و موافقت کے بجائے مسابقت، طبقاتی کشمکش اور منافرت کی فضا پیدا کریں۔

ایوب خاں نے اپنے ۱۹۶۱ء والے عائلی قانون کے ذریعے سے مرد کی طلاق کو عدالتی کارروائی پر معلق کرنے کی کوشش کی تھی۔ مزید برآں اس عائلی قانون کی دفعہ ۸ میں محض یہ گنجائش پیدا کی گئی تھی کہ جس بیوی کو خاوند نے حقِ طلاق تفویض کر دیا ہو۔ وہ عورت اس آرڈی ننس کی دفعہ ۷ کے تحت اس حق کو استعمال کر سکے گی۔ مگر اب جو ترمیم پیش کی جا رہی ہے اس کی رُو سے ہر عورت، خواہ اُسے خاوند نے حقِ طلاق تفویض کیا ہو یا نہ کیا ہو، بلا شرط و امتیاز یہ نام نہاد حق استعمال کر سکے گی اور جب وہ تنسیخ نکاح کا پروانہ عدالت کے (باقی بر صفحہ ۳۹)